R. No. 34663 Regd. No. 622

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Tele. No. 29
Telegrams
"ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۲ - شمارہ ۹	ایڈیٹر آل احمد سرور	علی گڑھ - یکم مارچ ۱۹۶۳ء

آل احمد سرور

علی گڑھ تاریخ ادب اُردو

دیباچہ

اُردو میں تذکرہ نگاری کی تاریخ خاصی پُرانی ہے۔ تذکروں میں ہلکے تنقیدی اشارے بھی ملتے ہیں، مگر صحیح معنوں میں تنقید کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں حالی سے ہوتا ہے۔ تذکروں میں شعرا عام طور پر حروف تہجی کے اعتبار سے لئے گئے ہیں۔ "آبِ حیات" میں سب سے پہلے ہمیں تاریخی دوروں کا التزام ملتا ہے، مگر مکمل ادبی تاریخ دراصل بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اردو ادب کی سب سے پہلی تاریخ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۶ء میں انگریزی میں لکھی جس کا ترجمہ اضافے کے ساتھ مرزا محمد عسکری نے اُردو میں کیا اور نول کشور پریس نے اسے شائع کیا۔ یہ تاریخ اب خاصی تشنہ معلوم ہوتی ہے، اور اس کے بہت سے خیالات موجودہ معلومات کی روشنی میں درست نہیں کہے جاسکتے۔ پھر بھی اس کی اوّلیت اور ایک حد تک افادیت مسلم ہے۔ اس میں سب سے پہلے نظم و نثر کے تمام اہم اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے اور ایک مجموعی تصویر پیش کی گئی ہے۔

بیسویں صدی میں اُردو ادب نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اس کی تیسری اور چوتھی دہائی میں تخلیق و تنقید کے ساتھ تحقیق کا ذوق بھی بڑھنے لگا۔ مغربی معیاروں سے اسے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ تذکرہ نگاروں اور نقادوں کے خیالات کو آنکھ بند کرکے تسلیم کرنے کے بجائے تصانیف کے براہِ راست مطالعے کے بعد ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ فن کے اسرار و رموز کے عرفان کے لئے فن کاروں کے مفصل حالات کی تلاش اور ان کی شخصیت کے پیچ و خم کی جستجو عام ہونے لگی۔ بیاضوں، مخطوطات اور دوسرے درجے کے شعرا اور ادیبوں کی تصانیف کے مطالعے سے بہت سا نیا مواد سامنے آیا۔ مختلف نسخوں کا مطالعہ کرکے صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ادب اور زندگی کے رشتے کا نیا احساس ہوا اور تنقید کو خالص فنی یا جمالیاتی پیمانوں سے دیکھنے کے علاوہ سماج اور تہذیب کے معنی خیز رشتے میں بھی دیکھا جانے لگا۔ تاریخ بھی بادشاہوں یا مشاہیر کے کارناموں کا سلسلہ نہ رہی، بلکہ قوموں کے ارتقا اور تہذیبوں کے نشوونما کی داستان بن گئی۔ اس میں اُس ماضی کی جستجو ہونے لگی جو حال کو جنم دیتا ہے اور جس کے بغیر حال معنی خیز نہیں ہو پاتا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد قدرتی طور پر اپنے سارے ذہنی سرمائے سے ایک نئی دلچسپی شروع ہوئی، جدید ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کی اہمیت کا اعتراف ہونے لگا اور اپنے ادبی سرمائے کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہوکر ایک طرف عالمی معیاروں کی روشنی میں اور دوسری طرف اپنی تاریخ اور اپنے ماحول کی روشنی میں پرکھا جانے لگا۔

۱۹۵۸ء میں شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "علی گڑھ تاریخ ادب اُردو" کی ایک اسکیم ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے اپنی سفارش کے ساتھ اسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سامنے رکھا۔ کمیشن نے جو علمی تحقیق کے کاموں میں فراخدلی سے

امداد دیتی ہے۔ اس اسکیم کو ۱۹۵۶ء میں منظور کر لیا اور ایک معقول رقم اس کے لئے عطا کی۔ مارچ ۱۹۵۷ء سے شعبۂ اردو کی نگرانی میں اس کا باقاعدہ دفتر قائم ہوا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی، جو اس وقت شعبے کے صدر تھے، اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ مارچ ہی سے ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا تقرر عمل میں آیا جس کے سپرد ڈائرکٹر کی نگرانی میں مضامین کی فراہمی اور مواد کی ترتیب و تہذیب کی گئی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے مارچ ۱۹۵۷ء سے اگست ۱۹۵۸ء تک کام کیا۔ یکم مئی ۱۹۵۸ء سے پروفیسر رشید احمد صدیقی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور اسکیم کی نگرانی راقم السطور کے ذمے کی گئی۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں احمد صدیقی مجنوں اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور اس وقت تک وہ اس کام میں میری مدد کر رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں ایک کانفرنس کر کے کام کا خاکہ بنایا گیا تھا اور مضمون نگاروں کے لئے عنوان تجویز کئے گئے تھے۔ شروع میں خیال یہ تھا کہ سال بھر کی مدت میں مضامین اکٹھے ہو جائیں گے اتنا ہی عرصہ ان کی ترتیب و تہذیب میں لگے گا اور دو سال میں طباعت کی منزلیں طے ہو سکیں گی۔ لیکن پہلی جلد کا پہلا مضمون جو تاریخی و تمدنی جائزے پر مشتمل تھا وقت پر نہ ملا اور مضمون نگار نے خاصی مدت گزر جانے کے بعد لکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ بعض مضمون نگاروں نے فرمائش کی کہ ہندوستان میں یا اس سے باہر جو مواد کتب خانوں میں ہے اس کی نقلیں فراہم کی جائیں۔ کچھ لوگوں نے شروع میں وعدہ کر لیا اور کئی تقاضوں کے بعد انکار کر دیا۔ کچھ لوگوں نے کئی بار مزید وقت مانگا۔ اس وجہ سے پروگرام کے مطابق کام نہ ہو سکا۔ ہمارے یہاں ابھی تک ایک منصوبے کے مطابق کام کرنے کے لوگ عادی نہیں ہیں۔ زیادہ تر اپنے شوق اور سہولت کے مطابق کام ہوتا ہے۔ ادیب اور نقاد وقت کی پابندی نہیں کر پاتے، اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ ادبی اور تنقیدی کاموں کو میکانیکی طور پر انجام دیا بھی نہیں جا سکتا۔ کچھ لوگوں کو ان معیار اور کام کا پورا اندازہ نہیں ہے جو آج عام طور پر ایسے کاموں کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، اس لئے کئی مضامین کو رد کرنا پڑا اور کئی میں خاص ترمیم و تنسیخ کرنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ چار سال کی مدت، جو اسکیم کو پورا کرنے کے لئے رکھی گئی تھی، ناکافی ثابت ہوئی۔ پہلی جلد سال بھر پہلے مکمل ہو گئی تھی لیکن اس کی طباعت کی رفتار باوجود تقاضوں کے خاصی سست رہی اور ۱۹۶۲ء میں صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔ اب یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۳ء میں تین جلدیں اور ۱۹۶۴ء کے شروع میں آخری جلد ضرور شائع ہو جائے۔ مشہور نقاد بونامی ڈوبری نے آکسفورڈ ہسٹری آف انگلش لٹریچر کی ساتویں جلد کے شروع میں کہا ہے کہ [illegible] سال کا کام ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادبی تاریخ میں مواد کی ترتیب و تہذیب اور ایک عمومی نظر کا تعین اتنا اہم ہوتا ہے کہ اچھے کام میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ اس لئے اگرچہ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد خاصی تاخیر سے شائع ہو رہی ہے مگر کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ مدت بہت زیادہ نہیں ہے۔

ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ملا ہے، اس لئے اس سلسلے میں مغربی نظریات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے یہاں اس سلسلے میں نقادوں اور ادبی مورخوں میں خاصا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر [illegible] بھی شامل ہوتا ہے۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عمری کہتا ہے۔ سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔ کزامیاں کا خیال ہے کہ انگلستان کی ادبی تاریخ اس کی قومی روح کے اخلاقی آہنگ کا زیر و بم ہے۔ کچھ لوگ اسے فن کی تاریخ سمجھتے ہیں جس میں دلچسپی کے لئے مصنفین کی سوانح عمریاں اور کچھ منفرد فن پاروں کی قدرشناسی (Appreciation) شامل ہو۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ ایسا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے۔ اے۔ سمنڈس ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے، کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض جرمن اور امریکی فلسفیوں نے اس وجہ سے ادب کے ارتقا کو حیاتیات کے ارتقا کی روشنی میں دیکھا ہے، اور اس مطالعے سے ادب کے مطالعے کے لئے اصول اخذ کئے ہیں۔ بہرحال ان اختلافات کے باوجود یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ادبی تاریخ میں ادب کے سارے سرمائے پر نظر ڈالی جانی چاہئے جس میں ہر دم اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جس اضافے سے پورا ادبی تصور متاثر بھی ہوتا ہے۔ ادب کے اس مطالعے کے لئے زبان کی خصوصیات کے علم کے علاوہ تاریخ اور تہذیب کا گہرا شعور اور سماج کے پیچ در پیچ رشتے کا علم اور جمالیات، فلسفے اور معانی و بیان کے ساتھ ان زبانوں کے ادب کا علم بھی ضروری ہے جن سے یہ زبان خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

یکم مارچ ۱۹۶۳ء

ہندی کے نادان دوستوں سے

پچھلے لوک سبھا اور راج سبھا کے مشترک اجلاس کو جب صدر جمہوریہ نے خطاب کیا تو ایک بہت نازیبا بات ہوئی۔ کچھ ممبروں نے جو سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے صدر کو خطبہ پڑھتے میں ٹوکا اور اصرار کیا کہ خطبہ پہلے ہندی میں پڑھا جائے اور جب اُن کی اس بدنما بات کا کوئی نوٹس صدر نے نہ لیا تو انھوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایوان سے باہر چلے گئے حالانکہ صدر نے انگریزی میں اپنا خطبہ جب ختم کیا تو اس کے فوراً بعد نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندی میں اس کا ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ اس سے پہلے اتر پردیش اسمبلی میں گورنر کے ساتھ بھی کچھ ویسا ہی سلوک ہو چکا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جن ممبروں نے یہ قدم اٹھایا انھوں نے ہندی کی کیا خدمت کی۔ کیا ڈاکٹر رادھا کرشنن سے اور شری بی داس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جس طرح ہندی بولنے والے ہندی میں تقریر کر سکتے ہیں اُسی طرح وہ بھی تقریر کریں۔ کیا اس طرح جنوبی ہند کے رہنے والوں اور ہندی نہ جاننے والی ریاستوں کے باسیوں کے لئے ایک مشکل پیدا نہیں کی جا رہی ہے؟ کیا اس طرح دوسری زبانوں کے حامیوں کے دل میں ہندی کے لئے محبت بڑھ سکتی ہے؟ کیا زبردستی ایسے معاملات میں جائز قرار دی جا سکتی ہے؟ اور جبکہ ہندی میں ترجمہ بعد میں دیا جاتا ہے تو صرف اولیت کی خاطر ایسی چھوٹی باتوں پر اصرار کس ذہنیت کا پتہ دیتا ہے؟

ہم لوگ اس وقت ہنگامی حالات سے دوچار ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ساری توجہ ملک کے بچاؤ کے لئے مناسب انتظامات پر مرکوز رکھیں اور ملک [illegible] کی طاقت برابر بڑھاتے رہیں۔ ہمیں اس کے لئے پورے اتحاد اور پھر پورے ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ اس وقت یہ مسئلہ ہرگز اہم نہیں ہے کہ پہلے ہندی میں تقریر ہو یا انگریزی میں۔ ابھی تو انگریزی یونین کی سرکاری زبان ہے اور جیسا کہ وزیر اعظم نے کہا ہے وہ ایک شریک سرکاری زبان کی حیثیت سے ایک طویل مدت تک اسی درجے پر فائز رہے گی۔

زبان کے معاملے میں سب سے بڑی چیز سہولت اور آسانی ہے۔ اگر لوگوں کو انگریزی میں آسانی ہے تو اسے خوش دلی سے قبول کر لینا چاہئے۔ اگر کوئی ہندی میں تقریر کرتا ہے تو اس پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہئے بشرطیکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی میسر ہو جائے۔ عام طور پر لوگ کئی زبانیں جاننے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں جو انگریزی جیسی عالمگیر زبان کو گاجر مولی کی طرح ہندوستان کی سرزمین سے کاٹ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بالآخر کسی ہندوستانی زبان کو انگریزی کی جگہ لینا ہے اور موجودہ حالات میں یہ زبان ہندی ہی ہو سکتی ہے، مگر انگریزی کے خلاف یہ جذبہ جس کی وجہ سے صدر، پارلیمنٹ کے وزن و وقار اور ہماری تہذیب، کسی کا پاس اہم نہیں رہا، اچھی چیز نہیں۔ اس سے خواہ مخواہ ہندی کے خلاف ضد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

دوسرے قومی معاملات کی طرح زبان کے مسئلے میں بھی بڑی سوجھ بوجھ، رواداری اور دل نوازی کی ضرورت ہے۔ وہی چیز اچھی ہے جسے سب مانیں اور سب دل میں جگہ دیں۔ ہندی کے نادان دوستوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ گزشتہ تاریخ اور برسوں کے نشانات کو ایک سانس میں نہیں بدلا جا سکتا اور زبان کے معاملے میں دوسروں کو اپنے ساتھ لینے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اپنی زبان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اس نازک موقع پر ایسی چھوٹی حرکتیں، ایک بڑی قوم کے افراد کو زیب نہیں دیتیں۔

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی کے ایگزیکٹیو بورڈ کا ایک جلسہ ۲۳ر فروری کو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی پچھلے تین سال کی کتابوں پر اکاڈمی کے انعامات کا فیصلہ ہوا۔ اردو کی بہترین کتاب پر انعام اختر الایمان کے مجموعۂ کلام 'یادیں' کو دیا گیا ہے۔ اس جلسے میں ساہتیہ اکاڈمی کی نئی کونسل کی تشکیل ہوئی۔ اس میں اردو کے نمائندوں میں پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد مجیب منتخب ہوئے ہیں۔ اکاڈمی کی نئی کونسل کا جلسہ ۳۱ر مارچ کو ہوگا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو انعامات تقسیم کریں گے۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ انعامات بجائے بانڈ کی صورت میں دئے جائیں۔

ترکی میں لسانی اصلاحات

پروفیسر فیض عزجو، استانبول یونیورسٹی میں ترکی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں، حال میں علی گڑھ تشریف لائے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں ایک تو [illegible] میں لیکچر دیا جس کا عنوان

ترکی میں لسانی اصلاحات' تھا۔ اس لیکچر میں انھوں نے واضح کیا کہ قومیت کے جذبے کی پختگی کی وجہ سے عربی اور فارسی کی اصطلاحات کے بجائے ترکی اصطلاحات لاکھوں کی تعداد میں وضع کی گئی ہیں اور وضع کرنے میں قدیم کتابوں یا عوام کی بول چال سے مدد لی گئی ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لاطینی رسم خط اختیار کرنے کی وجہ سے خالص ترکی آوازوں کو مناسب اہمیت ملی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جدید ترکی زبان آسانی اور افادیت پر زور دیتی ہے۔

یوم غالب

۱۵ر فروری کو انجمن ترقی اردو شاخ دلی کے زیر اہتمام مزار غالب پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر انجمن ترقی اردو (ہند) نے ادا کیے، ممبران انجمن کے علاوہ جامعہ ملیہ اور دلی یونیورسٹی کے ذی علم حضرات اور معزز شہریوں سرکردہ شاعروں اور ادیبوں نے شرکت فرمائی۔

تقریب کا آغاز مزار پر فاتحہ خوانی اور گل افشانی سے ہوا۔ پھر درگاہ نظام الدین کے قوالوں نے غالب کی کئی غزلیں سنائیں۔ جلسے کا افتتاح دلی کارپوریشن کے میئر جناب نورالدین احمد صاحب نے فرمایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں میئر صاحب نے فرمایا کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ انقلابات ہوتے رہتے ہیں، ہندوستان بھی بہت کچھ بدلا، لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود حضرت غالب کو اب بھی اس ملک کا بہت بڑا فن کار مانا جاتا ہے، زمانے کی تبدیلیوں نے مرزا غالب کے کلام کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا، بلکہ اس کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ غالب کے معاصرین میں اردو فارسی اور عربی کے جید عالم ادیب اور شاعر شامل ہیں لیکن غالب کا سا حسن طبیعت اور دل میں کھب جانے والا انداز کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ غالب کی انفرادیت اور طبع کی رسائی اتنی اونچی ہے کہ اس تک کسی کی پہنچ نہ ہو سکی' وجہ خواہ کچھ بھی ہو، قبول عام کا درجہ دنیائے ادب میں جس طرح غالب کو ملا اور کسی کو حاصل نہیں ہوا اور یہ بات ہمارے لئے بڑی فخر کی ہے کہ ایک ایسے عظیم شاعر کے مسکن بننے کا فخر دلی کو حاصل ہوا۔

صدر جلسہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صاحب نے اپنے مخصوص دل نشین انداز میں بصیرت افروز تقریر فرمائی اور بہترین الفاظ میں حضرت غالب کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ غالب کی ذات پر تخصیت ایسی ہے جس کی خوبیوں کا تذکرہ کرنے کو دل یا ... چاہتا ہے، مرزا کے زمانے میں اور بھی مستند نامور شعرا تھے، شیفتہ، ذوق، مومن، صہبائی اور ... وغیرہ ... یہ سب اردو کے آسمان پر تابندہ ستارے بن کر چمکے۔ غالب کی بھی اس زمانے میں کافی قدر افزائی ہوئی، شاعروں اور سخن فہموں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو غالب کو پسند کرتی تھی، لیکن مرزا کو اس کا احساس تھا کہ ان کی قدر جو ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ ایک پیش گوئی ثابت ہوا اس کی تصدیق زمانے اور تجربے نے کر دی۔

صدر محترم نے بڑی تفصیل کے ساتھ غالب کی مقبولیت ان کے کلام کی ہمہ گیری اور اس کے اسباب پر بحث کی اور انھوں نے اس سلسلے میں حالی کے مقولے کا حوالہ دے کر غالب کے یہاں صوفیانہ تصوف پر روشنی ڈالی جو غالب کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔ غالب کے افکار و احساسات ہمارے آج کے تجربات پر پورے اترتے ہیں، ان کی وفات کو ایک سو سال کے قریب ہونے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ غالب کے کلام کو اتنی مقبولیت حاصل ہوگی جو آج حاصل ہے، جب تک اردو اور اردو داں طبقہ زندہ ہے غالب کی چیدہ چیدہ غزلوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ہر شاعر اپنے زمانے کا اثر قبول کرتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کو اس خصوصیت نے زندہ رکھا کہ انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے لکھا ہے اگر دو سو تین سو سال بھی گزر جائیں تو ان کا کلام زندہ رہے گا اور ان کا شمار ماڈرن شاعروں میں کیا جائے گا۔ جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے اتنی ہی غالب کی شاعری کی دلآویزی ترقی کرتی جاتی ہے۔

صدارتی تقریر کے بعد مولانا انور صابری اور رعنا جگی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا پھر طرحی مشاعرہ ہوا مشاعرے کی صدارت بیگم انیس قدوائی نے فرمائی، مصرع طرح تھا:۔

"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے"

جن شعرائے کرام نے اس مشاعرے میں حصہ لیا ان میں روش صدیقی، انور صابری، خار دہلوی، سلام مچھلی شہری، رعنا جگی، نریش کمار شاد، مشیر جھنجھانوی، گلزار دہلوی، بہار برنی، درویش جیند انقش، ہیرا لال فلک، صابر ابوہری، گوہر سلطانی شامل تھے۔

مشاعرے کے آخر میں مرزا غالب کی طرحی غزل دلی کے مشہور فن کار جناب نصیر خاں نے پیش کی اور اپنی سحر انگیز آواز اور فن کارانہ انداز سے لطف کا سماں باندھ دیا۔

غالب کی دوسری غزل جالندھری صاحب نے پیش کی اور پھر جلسے کا اختتام غالب کی ایک غزل پر ہوا۔

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

نصیر خاں نے اس غزل کو پورے فنکارانہ انداز سے پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا، اور یہ محفل کی نشست جو ڈھائی بجے بعد دوپہر سے شروع ہوئی تھی ساڑھے پانچ بجے ختم ہوئی۔

(سکریٹری)

عنوان چشتی ایم۔اے

"نئے سال کا تحفہ"

واقعی تم ہو عنایت کی مکمل تصویر
شکریہ تم نے نئے سال کا تحفہ بھیجا
اک حسیں ریشمی رومال کا تحفہ بھیجا
جس نے پھر جذبِ محبت کو توانائی دی
دلِ بے تاب تمنا کو شکیبائی دی
میرے کاشانۂ تخئیل کو رعنائی دی
شکریہ تم نے نئے سال کا تحفہ بھیجا
اک حسیں ریشمی رومال کا تحفہ بھیجا
تم کہ ہو میری محبت کی مکمل تصویر
بالفعل بھیج دو، رومال کو واپس لے لو
ورنہ پھر مجھ سے نئے سال کو واپس لے لو
چاہتا ہوں کہ اب اظہارِ خیالات کروں
صرف اپنی نہیں دنیا کی بھی کچھ بات کروں
آج رنگیں نہیں سنگین سوالات کروں
بالفعل بھیج دو، رومال کو واپس لے لو
ورنہ پھر مجھ سے نئے سال کو واپس لے لو
تم کہ ہو فہم و فراست کی مکمل تصویر
خوب واقف ہو ہمالہ کی ضرورت کیا ہے
عہدِ حاضر کی خطرناک سیاست کیا ہے
یہ زمانہ ہے نیا غم بھی نئے دل بھی نئے!
ذہن و افکار نئے جادہ و منزل بھی نئے
قوم کے سامنے ہیں آج مسائل بھی نئے
خوب واقف ہو ہمالہ کی ضرورت کیا ہے
عہدِ حاضر کی خطرناک سیاست کیا ہے
تم کہ ہو خوابِ محبت کی مجسم تعبیر
میرا ایماں ہے محبت پہ حکومت بھی نثار
لیکن آزادیٔ انساں پہ محبت بھی نثار
دلِ معصوم کے ہر جذبۂ پنہاں کو سلام
مسکرانے کے ہر اندازِ گل افشاں کو سلام
چشمِ بد دور تمہارے رخِ تاباں کو سلام
میرا ایماں ہے محبت پہ حکومت بھی نثار
لیکن آزادیٔ انساں پہ محبت بھی نثار

سلام بن رزاق پنویلی

اُمید

بہہ رہا ہے مرے اطراف سمندر غم کا
جس میں افلاس کی موجیں ہیں تلاطم زدہ سا
لیکن اس بحرِ غم و یاس کے طوفانوں میں
ایک امید کا چھوٹا سا جزیرہ بھی ہے
جو کھڑا ہے کسی بے خوف سپاہی کی طرح

غزلیں

گوپی ناتھ امن

بہار نا معتبر نہ کہئے بہار نا معتبر نہیں ہے
کوئی بھی شے معتبر نہیں ہے جو اعتبارِ نظر نہیں ہے
بہار کو ہیچ کہنے والو تمہیں شعورِ نظر نہیں ہے
وہ گل بھی ہے شاخ کی رگوں میں ہنوز جو شاخ پر نہیں ہے
گجر بجا ہے اذاں ہوئی ہے سحر کے آثار ہیں نمایاں
ستارۂ صبح کیوں کہے گا ابھی نمودِ سحر نہیں ہے
یہ رہرووں کو ہے خبط کیسا کہ راہبر کو بتائیں منزل
جو پوچھے خود رہرووں سے منزل وہ راہبر راہبر نہیں ہے
یہ فکرِ سود و زیاں ہے کیسی کرو نہ توہین زندگی کی
نہ جس میں حرص ہو وہ دل نہیں ہے نہ جس میں سودا ہو سر نہیں ہے
رہِ صداقت پہ چلنے والو یہاں کوئی ٹولیاں نہ ڈھونڈو
یہاں تو چلتے ہیں اکے دکے کہ عام یہ رہگذر نہیں ہے
سکوت ہے فکر کا نتیجہ نگاہِ ہر مجلسی تو دیکھو
خموشیوں میں ہے راز پنہاں یہاں کوئی بے خبر نہیں ہے
یہ اہلِ گلشن پہ منحصر ہے کہ حوصلہ اپنا آزمائیں
ہے عام جوشِ نمو کا فیضاں کوئی بھی بے بال و پر نہیں ہے
نہ امن کو ہم نے مسجدوں میں نہ مندروں میں کہیں بھی دیکھا
عبادت اس مردِ منحنی کی رہینِ دیوار و در نہیں ہے

آزاد گلاٹی

ترے خیال کی تصویر بن گیا ہوں میں	خود اپنے خواب کی تعبیر بن گیا ہوں میں
خموشیوں کو ملا ہے وہ ذوقِ گویائی	سراپا عالمِ تقریر بن گیا ہوں میں
اگرچہ میرا مقدر نہ بن سکا مجھ سے	کسی کے عشق کی تقدیر بن گیا ہوں میں
مری حیات کی مجبوریاں! ارے توبہ!!	اب اپنے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہوں میں

حسرت سحروردی

تم نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے	ایک غمگین داستاں ہوتے
زندگی یوں نہ بوجھ بن جاتی	تم اگر مجھ پہ مہرباں ہوتے
آپ کے غم کی خیر ہو ورنہ	ہم قتیلِ غمِ جہاں ہوتے

عارف حسین عارف رتلامی

ہوا ہے تلخ تجربہ یہ دوستوں سے مجھے
ذرا بھی مہر و محبت میں چاشنی نہ رہی
ہوئی نصیب مجھے یوں تو ہر خوشی لیکن
غمِ حبیب سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ رہی
نگاہِ شوق تو اب بھی ہے ملتفت عارف
مگر وہ برق جمالوں میں دلکشی نہ رہی

جاوید نہال

رسالہ ماخذ علوم

"ماخذ علوم" فروری ۱۸۶۷ء میں ختم ہوئی اور اپریل ۱۸۶۷ء یعنی ان دو ماہ کی قلیل مدت میں "اہل تشیع کے مشہور چھاپہ خانہ "مظہر العجائب کلکتہ" میں چھپی اور وہیں سے شائع ہوئی۔ یہ مولوی کرامت علی جونپوری کی ایک مفید، علمی اور ادبی تصنیف ہے۔

مولوی کرامت علی جونپوری ۱۸۰۰ء میں جونپور سے متصل ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اس مناسبت سے مولوی صاحب اپنے نام کے ساتھ جونپوری لکھتے ہیں، گاؤں میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہوگلی چلے آئے، اور امام باڑہ محسنیہ کے متولی مقرر ہوئے، اور اپنی زندگی کا بقیہ حصہ ہوگلی میں گذارا اور وہیں ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا، اور دفن ہوئے، ان کی لوح مزار پر ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔ مولوی صاحب اہل تشیع کے جید عالم اور کامیاب مجتہد تھے۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر امام باڑہ کے منقش ہال میں آویزاں ہے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ امام باڑہ محسنیہ کی تعمیر ہے ان کے متولی ہونے سے قبل، ہوگلی امام باڑہ چھوٹا سا تھا، انھوں نے اس چھوٹے سے "خانہ نما" امام باڑہ کو اصفہان کے عالیشان امام باڑہ کے طرز اور نقش پر ایک عالیشان اور یادگار امام باڑہ میں بدل دیا، امام باڑہ کا صحن کشادہ ہے، اس کے کلس طلائی تھے،

وسیع اور کشادہ صحن میں ایک لمبوترا تالاب ہے، جس میں زعفرانی رنگ کی عجیب غریب مچھلیاں خاص اہتمام سے پالی جاتی ہیں، "ہال" کشادہ، خوبصورت اور جاذب نظر ہے، فرش سنگ مرمر کا ہے۔ "پانچ دروازے" ہیں، ایک تخت نما منبر ہے اور دیواروں پر قرآن پاک کی آیات "طغرائی خط" میں منقش ہیں، جو انیسویں صدی عیسوی کی خوش نویسی اور فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، امام باڑہ کے "گھنٹہ گھر" کو تاریخی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔

اس مذہبی عظیم کارنامہ کے علاوہ مولوی صاحب نے ایک ناقابل فراموش علمی و ادبی یادگار بھی چھوڑی ہے جو ادبی دنیا میں ان کے نام کو زندہ جاوید رکھے گی، ان کی اس علمی و ادبی یادگار کا نام "رسالہ بیان ماخذ علوم" ہے، اس کتاب میں مولوی صاحب نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ارضی و سماوی رازہائے سربستہ رفتہ رفتہ منکشف ہوتے جا رہے ہیں، اور بہت سی ایسی گرہیں عقل انسانی نے اپنے ناخن سے کھول لی ہیں، جو اب تک غیر مفتوح تصور کی جاتی تھیں۔ اس ضمن میں مولوی صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس طرح عربوں نے یونانیوں سے، اور عربوں سے فرنگستانیوں نے علم سیکھا، ویسے ہی آج کے ہندوستانی، خصوصاً مسلمان مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خول کو اپنے بدن سے اتار پھینکیں تو یورپین قوموں سے علمی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں،

مولوی صاحب نے ماخذ علوم کے ضمیمہ میں آیتوں اور حدیثوں کے حوالے سے علم ہیئت جدیدہ، اور دیگر فلکی مسائل و رموز کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں ان مختصر رسالوں میں مولوی صاحب نے علوم و فنون اور تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزانہ سمیٹ لیا ہے۔ گویا ایک کوزہ میں علوم و فنون کا دریا سمو دیا ہے،

مولوی صاحب کی یہ گراں بہا کتاب ۱۸۶۷ء میں پہلی بار کلکتے میں شائع ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

مولوی صاحب ماخذ علوم کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"ماجد کہتا ہے کرامت علی بن رحمت علی جونپوری کہ یہ چھوٹا رسالہ ہے بیان میں ماخذ علموں کے۔ یعنی آدمیوں نے کہاں سے علم پایا اور بیان میں اس کے کہ کتنا فائدہ علمی حاصل کیا اور اب مسلمان کتنے فائدے حاصل کر سکیں گے اختلاط سے اہل فرنگستان کے"

انھوں نے کتاب کے خاتمہ پر اپنی کم مائگی اور کم دانی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے، اور انھوں نے کہیں سے کچھ نہیں لیا ہے،

"اہل دانش کی خدمت میں اپنی نادانی کا اقرار و عذر کرتا ہوں، اور صاف لکھتا ہوں کہ میں انگریزی زبان کچھ نہیں جانتا اور پیدائش میری گاؤں کی ہے، وہیں بزرگ ہوا اور عنفوان شباب سے سفر میں رہا اسی سبب سے ہندی زبان (اردو) بھی میری بہت کچی ہے اور کبھی ہندی میں لکھنے کا اتفاق بھی نہیں پڑا۔ جو اہل دانش اس رسالہ کو دیکھیں گے سمجھیں گے کہ جو مضامین نئے اس رسالہ میں ہیں میری طبع غیر مطبوع نے نکالے ہیں کسی نے مجھ سے پہلے سبقت نہیں فرمائی" (ص ۱۰۹)

مولوی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی شروع میں سفر میں گذری، جونپور میں وہ جوان ہوئے، اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انھوں نے ایران اور دیگر ممالک کا بھی سفر کیا ہوگا۔ انگریزی زبان سے عدم واقفیت کے باوجود انھوں نے اس رسالے میں جس ادراک و استدلال سے علوم و فنون اور ہیئت جدیدہ پر اظہار خیال فرمایا ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ فارسی اور عربی زبان اور ادب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اس سمندر کے وہ ایسے غواص تھے جس کی نگاہ دوربین سے کوئی بھی موتی دریا کی تہ میں بچ نہ رہا ہو،

رسالہ بیان ماخذ علوم پہلے مقدمہ سے شروع ہوتا ہے۔

"معلوم ہو کہ آدمی لوگوں میں کہ ادراک کے آلات کے واسطے حیوان کو ملا ہے، کم کم آہستہ آہستہ علموں کو حاصل کرتے ہیں، اور جتنا اصلی حالت سے دور ہوتے ہیں اتنا ہی علم

اور مشقتوں سے نزدیک ہوتے ہیں، لیکن اس کسب کے واسطے معلم یعنی سکھلانے والا ضروری ہے۔ سب سے پہلے سکھلانا زبان کا ہے، دیکھو لڑکوں کے ساتھ کتنا بکنا پڑتا ہے جب وہ بات کرنے (کرنی) سیکھتے ہیں اور بڑی محنتوں سے حرفوں کو ان کے خاص مخرجوں سے اور خاص وصفوں کے ساتھ نکلنے (نکالتے) ہیں، یہ بات اور استادوں سے بھی معلوم ہوتی ہے، چنانچہ اکبر شاہ تیموری نے ایک مکان بنوایا اور اس میں دودھ پلانے والی (عورت) اور مرد سب گونگے بہرے لاکے رکھے اور لڑکے نوزاد ان کو پرورش کے واسطے سونپے لیکن وہ لڑکے بعد رشد کے قادر کلام پر نہ ہوئے۔"

(ص ۲)

مولوی صاحب نے دوسرے مقدمے میں حضرت نوحؑ سے نسل انسانی کی دوبارہ افزائش کا حال لکھا ہے، طوفان نوحؑ میں ساری خلقت غرق ہو گئی، حضرت نوحؑ ان کی بیوی، اور تین بیٹوں، اور عوج بن عوق[1] کے سوا اور کوئی نہ بچا، ان سے انسانی نسل پھر چلی، اس مناسبت سے حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

"ماخذ علوم" کا چوتھا مقدمہ نہ صرف دل چسپ ہے بلکہ مفید اور معلومات افزا بھی ہے، اس مقدمے میں مختلف السنہ پر بحث دلچسپ انداز میں ملتی ہے، دنیا میں بے شمار زبانیں رائج ہیں، لیکن سب سے پرانی زبان سریانی ہے، اور دوسری قدیم ترین زبان عربی ہے، ان سے دوسری زبانیں نکلی ہیں۔

"مسلمانوں کی تواریخ میں اور حدیثوں میں ہے کہ حضرت آدم اور ان کی ذریت کی زبان طوفان کے قبل تک سریانی تھی، شیعوں کی حدیث میں ہے کہ حضرت نوح و حضرت صالح و حضرت ہود و حضرت لوط و حضرت شعیب (پیرو دین موسیٰ) و حضرت خاتم پیغمبران کی عربی زبان تھی، لیکن اختوں میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح و حضرت ہود و حضرت لوط علیہم السلام کے نام مجھ میں عربی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ان ناموں کے وزن اور مشتقات سب عربی ہیں تو عجم کیوں ہونے لگے۔ اور یہ کہ شہر بابل کے بنانے میں فلیج بن عیبر کے وقت میں خلل پڑا اور زبانیں بدل گئیں۔"

(ص ۹)

مولوی صاحب نے زبانوں کی ابتداء آفرینش پر سیر حاصل بحث کی ہے اور آخر میں دلائل و براہین کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قدیم ترین زبانیں سریانی اور عربی تھیں، پھر فارسی لاطینی اور سنسکرت وغیرہ وجود میں آئیں، اس طرح چراغ سے چراغ جلے، زبان سے زبانیں پیدا ہوئیں۔

ساتویں مقدمہ میں مولوی صاحب نے یونان کی زبان تاریخ اور ثقافتی زندگی کی دلکش تصویر کھینچی ہے، مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ

"یونانی اولاد سے یونان بن یافث بن نوح کے ہیں، ابتدا میں وہ لوگ وحشی تھے، اسباب تمدن سے کچھ واقفیت نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شادی بیاہ بھی نہ جانتے تھے۔ اڑھائی ہزار برس تخمیناً قبل ہجرت کے کچھ مسافر وہاں جاکے بسے، وہ بت پرست تھے ان کا رویہ اور انتظام اچھا نہ تھا۔" (ص ۱۶)

بقول مولوی صاحب حضرت موسیٰؑ کی پرورش کے وقت ایشیا کوچک سے ایک قوم بھاگ کر یونان کے جزیرے میں آباد ہوئی، اس قوم سے یونانیوں نے رہنے سہنے کا طریقہ سیکھا، علم، ہنر و فن کاشتکاری، اور کان کنی سیکھی اور بتدریج مختلف علوم میں دستگاہ اور مہارت حاصل کرکے ایک قابل رشک عظیم مہذب قوم بن گئی، پھر ان سے رومیوں نے تہذیب کا چراغ روشن کیا، جن کی وساطت سے تمدن کا نور ساری دنیا میں پھیل گیا، اور جہالت کا گھپ اندھیرا گھٹنے مٹنے لگا۔

"ماخذ علوم" میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت، حضرت عیسیٰؑ پر رومیوں کی سختیاں، ان کے لرزہ خیز مظالم اور پھر سخت ایذائیں دے کر حضرت یسوع مسیح کو شہید کرنے کی روایت بے حد موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی طاقتور ہونے کے باوجود بے رحم، خونی اور ظالم تھے، اور ان کے پاؤں تلے تہذیب اور انسانیت کچل کر سسک رہی تھی، کراہ رہی تھی۔

"غرض خاتم پیغمبران، پیغمبر آخر الزماں کے مبعوث ہونے سے قبل سب ملکوں میں کیا خاص کیا عام جہالت کی تاریکی پھیل گئی تھی، ویسا ہی برخلاف [illegible] کے جب وہ حضرت مبعوث ہوئے سارا جہان [illegible] کے نور سے روشن ہو گیا، یہود ——— [illegible] بعض عیسائی بادشاہوں نے، صابیوں نے، بعض مجوسیوں نے، بت پرستوں نے اطیب خاطر حضرت کے دین کو قبول فرمایا، علوم سیکھے، جو کوئی ایک دفعہ بھی حضرت کی خدمت میں مشرف ہوا ہے ان سے پڑھ کے علم حاصل کیا۔" (ص ۱۰)

ایسی پر از معلومات، مفید اور دلچسپ روایتیں ہر مقدمہ اور ہر فصل بحث ملتی ہیں، لیکن بعض بعض باب میں مولوی صاحب نے جذباتی انداز اختیار کر لیا ہے اور سنجیدگی، معقولیت اور رواداری کی حدود سے وہ متجاوز ہو گئے ہیں، "جانبدارانہ عقیدہ" کی تبلیغ و اشاعت بے دھڑک کی ہے، اسکندریہ کے کتب خانہ کے نذر آتش کئے جانے کے متعلق، "الخرض" ، اگر کسی شاذ و نادر کے

---

[1] عوج بن عوق، دنیا کا سب سے لمبا انسان گزرا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ عوج بن عوق اتنا لمبا تھا کہ طوفان نوح میں پانی اس کی چھاتی تک پہنچا۔ اُسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہلاک کیا تھا۔ (ج ، ن)

پر لکھ دیا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے حکم سے عمرو بن عاص نے نادر اور قیمتی کتابیں جلا دی تھیں۔

مولوی صاحب راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور اثنا عشری امام پر ایمان رکھتے تھے، انھوں نے جابجا ان اماموں کی برکت، فضیلت اور کرامت کے ذکر کے دوران ان سے اپنی والہانہ شیفتگی اور الفت کا اظہار شدت سے کیا ہے اور فرطِ محبت میں دوسرے فرقوں کی رسوم، طریقوں اور عقیدوں کی کبھی کھل کر کبھی دبے الفاظ میں مخالفت کی ہے،

مذہبی فلسفہ اور عقیدوں کے بیان میں مولوی صاحب کا قلم لغزش کھا گیا ہے، انھوں نے استدلال و ادراک کے بجائے اپنی بحث میں "جذبات" کو سہارا بنایا ہے۔ لہذا "جذباتی انداز" کی پرچھائیں، کتاب کی بعض خوبیوں پر پڑتی ہے بعض مسائل کے سمجھنے میں انسانی ذہن کو مدد نہیں ملتی ہے بلکہ یہ الجھنے لگتا ہے، اور جذباتی مباحثہ کی بھول بھلیوں میں وہ گم ہو کر رہ جاتا ہے،

ان خامیوں کے علاوہ مولوی صاحب کی زبان میں ناہمواری اور طرزِ بیان روکھا پھیکا ہے، مگر چونکہ ان کی یہ کتاب ایکسو سال قبل لکھی گئی ہے۔ اس لئے یہ کمزوریاں گوارا کی جا سکتی ہیں ویسے ان کی یہ تصنیف پایہ کی ہے، جس میں رموز و نکات کے موتی ہر صفحہ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

"رسالہ ماخذ علوم" ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے، اور خوبصورت ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ آخر میں چار صفحات میں اغلاط نامہ درج ہے۔

"رسالہ ماخذ علوم" کی اشاعت کے پورے ایک سال بعد اس کا ضمیمہ بھی مولوی صاحب نے تصنیف کیا، ضمیمہ بھی مظہر العجائب پریس کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ ضمیمہ ۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں جدید سائنس، ہیئت جدید اور دیگر فلکی و ارضی مسائل پر دلچسپ بحثیں ملتی ہیں، جدید علم سائنس کی تحقیقات کی احادیث اور قرآن پاک کی آیات کے حوالہ سے تائید اور تردید کی گئی ہے، ہر فصل میں حدیث اور قرآن کے حوالے سے زمین، آسمان، سیاروں اور ستاروں کے فاصلے بھی بتائے گئے ہیں۔

"رسالہ بیان ماخذ علوم" سر چارلس ترویلین کے نام معنون کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے ان کی فرمائش اور ترغیب پر یہ کتاب تصنیف کی تھی، ماخذ علوم کے مطبوعہ نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان دو نسخوں کے علاوہ اور کسی نسخہ کا پتا نہیں چلتا، اب ایک حد تک نایاب ہے، دوبارہ شائع ہو جاتی تو ایک مفید، علمی و ادبی اور دلچسپ کتاب سے عوام مستفیض ہو سکتے ہیں۔

مراسلہ

"حیدر آباد کے اخبارات"

ہماری زبان کے شمارے مورخہ یکم فروری ۶۳ء میں علی افسر صاحب کا ایک مضمون "حیدر آباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں اگر دیانتدارانہ جائزہ لیا جاتا تو ہمیں کوئی شکایت نہ ہوتی۔ ایک اخبار کے معیار کی مذمت کرتے ہوئے، دوسرے اخبار کی تعریف کرنا تنقید کا کوئی اصول نہیں بلکہ صرف پروپگنڈہ ہے۔ فاضل مضمون نگار کی شاید لاعلمی کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے "سیاست" کے سنڈے ایڈیشن کی ترتیب شاہد صدیقی مرحوم سے وابستہ کی ہے۔ شاہد مرحوم نے کبھی بھی سنڈے ایڈیشن مرتب نہیں کیا وہ صرف مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ادبی ایڈیشن جو صاحب ترتیب دیتے ہیں وہ وہی ہیں جو ابتدا سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

تنقید ضروری اور مفید ہے تاکہ کام کرنے والوں کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے اور وہ بہتر طریقے پر کام کریں، لیکن تنقید غیر ضروری توصیف یا تنقیص کا نام نہیں۔

(عابد علی خان، ایڈیٹر سیاست)

فارم ۱۷

دیکھو رول ۸

اخبار ہماری زبان علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل، علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت	ہفتہ وار
۳۔ نام پرنٹر	ضمیر الدین قریشی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	مسلم ایجوکیشنل پریس، محلہ بنی اسرائیلان علی گڑھ
۴۔ نام پبلشر	نذیر حسن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ
۵۔ نام ایڈیٹر	پروفیسر آل احمد سرور
قومیت	ہندوستانی
پتہ	شبلی روڈ، علی گڑھ
۶۔ نام پتہ مالک اخبار	انجمن ترقی اردو ہند، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ

میں نذیر حسن تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۶۳ء　　نذیر حسن

حبیب الرحمٰن

انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش

"انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۹۶۲ء ذیل میں درج کی جا رہی ہے، جو حیدرآباد میں ۱۰ر فروری سنہ ۱۹۶۳ء کو انجمن کے جلسۂ عام میں پیش کی گئی تھی۔ (ادارہ)

جناب صدر! آپ کی اجازت سے میں اوّلاً ایک مختصر رپورٹ انجمن کی کارگزاری سے متعلق پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے اراکین کی تعداد کا مسئلہ ہے۔ یہ تعداد سو اور سوا سو کے درمیان کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ تعداد قطعاً اطمینان بخش نہیں ہے۔ حیدرآباد ہمیشہ سے اُردو کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اُردو مادری زبان والے یہاں لاکھوں کی تعداد میں بستے ہیں اور جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے ان کی بھی ایک بڑی تعداد اُردو بولتی اور سمجھتی ہے۔ باوجود اس کے اراکین کی اس قدر کم تعداد ہم سب کے غور اور توجہ کی مستحق ہے۔

دوسرا مسئلہ انجمن کی مالی حالت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ مالی حالت کا بھی اراکین کی تعداد ہی سے تعلق ہے۔ چونکہ اراکین کی تعداد بڑھتی نہیں اس لئے مالی حالت میں بھی کوئی بہتری نہیں پیدا ہوتی اور اس وجہ سے انجمن کی جدوجہد کا دائرہ وسیع نہیں ہونے پاتا۔ سرکاری امداد ملا کر ہماری سالانہ آمدنی ساڑھے پانچ ہزار اور چھ ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے، جس میں سے مبلغ ڈھائی ہزار روپے اُردو کالج کو دئے جاتے ہیں اور باقی رقم دارالمطالعوں اور تعلیم بالغان کے مرکزوں کی امداد، کتابوں کی اشاعت، اراکین کے لئے اخبار "ہماری زبان" کی سربراہی، عملے کی تنخواہ اور مصارف ڈاک، ٹیلیفون، ٹائپ وغیرہ پر خرچ ہوتی ہے جیسا کہ گذشتہ تین سال کے موازنے سے ظاہر ہے۔

جہاں تک انجمن کی سرگرمیوں کا تعلق ہے ہماری توجہ سب سے زیادہ تعلیم کے مسئلے پر مرکوز رہتی ہے کیونکہ یہی حقیقت میں اُردو زبان کی آئندہ بقا اور ترقی کی بنیاد ہے۔ اضلاع اور تعلقات سے انجمن کے دفتر پر برابر شکایتیں آتی رہتی ہیں۔ کہیں باوجود کافی تعداد کے اُردو کی جماعتیں نہیں کھولی گئی ہیں۔ کہیں اُردو کی جماعتیں تو کھول دی گئی ہیں لیکن اساتذہ کا انتظام نہیں ہے۔ کہیں اساتذہ تو موجود ہیں لیکن وہ اُردو میں پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کہیں جماعتیں کھولنے کے لئے روپے، فرنیچر، سامان تعلیم یا جگہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جونہی ہمیں کوئی شکایت وصول ہوتی ہے ہم فوراً نظامت تعلیمات کو اس سے مطلع کرتے اور اس کے انسداد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کئی صورتوں میں ہمیں کامیابی ہوتی ہے لیکن زیادہ شکایات کسی نہ کسی وجہ سے بلا انسداد باقی رہ جاتی ہیں۔ تجربے سے اندازہ ہوا کہ اگر مقامی افراد یا جماعتیں تھک کر بیٹھ نہ جائیں بلکہ برابر اپنے مطالبات دہراتی رہیں اور جہاں ممکن ہو مقامی ذی اثر حضرات کو بھی اپنی تائید پر آمادہ کریں تو انھیں بالآخر کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ نظامت تعلیمات کے طرز عمل میں گذشتہ چند دنوں سے ایک خوش گوار تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ وہ بمقابل پہلے کے اب ہمارے مطالبات پر زیادہ توجہ دینے لگے ہیں اور وقتاً فوقتاً ہمارے مراسلات کے جوابات بھی روانہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ نتیجہ ہو ہماری ان نمائندگیوں کا جو گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے اندر چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں کی گئی تھیں۔

غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ مئی سنہ ۱۹۶۱ء میں انجمن کا ایک وفد اس وقت کے چیف منسٹر شری ڈی سنجیویا سے ملا تھا اور ایک مفصل یادداشت ان کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس یادداشت کے متعدد امور سے متعلق ایک تفصیلی جواب ہمیں چیف سکریٹری کے دفتر سے کئی ماہ بعد وصول ہوا جو مجلس انتظامی کی رائے میں تشفی بخش نہیں تھا۔ اس لئے ستمبر ۱۹۶۲ء میں انجمن کا ایک اور وفد موجودہ چیف سکریٹری شری سنجیوا ریڈی سے ملا اور ایک تازہ یادداشت انکی خدمت میں پیش کی۔ اس کے متعلق ہمیں ابھی کوئی دو ہفتے پہلے چیف سکریٹریٹ سے ایک مراسلہ ملا ہے جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ہمارے پیش کردہ مختلف نقاط کے بارے میں متعلقہ دفاتر تحت کو لکھ دیا گیا ہے جہاں سے راست جوابات دئے جائیں گے۔

اس سلسلے میں شاید یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ریونیو بورڈ کے چند اُردو داں ملازمین کی طرف سے معتمد انجمن اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ وزیر متعلقہ شری رام چندر ریڈی سے ملے اور انھیں بتایا کہ ان ملازمین کو قبل از وقت وظیفہ دے کر اس لئے علیحدہ کر دیا کہ وہ انگریزی سے واقف نہیں ہیں خلاف انصاف ہے۔ شکر ہے کہ ہماری نمائندگی کامیاب ہوئی اور یہ ملازمین قبل از وقت وظیفہ پر علیحدہ نہیں کئے گئے۔ اسی طرح معتمد انجمن اور پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب وزیر محکمۂ قانون شری پی وی نرسمہا راؤ سے ملے اور انھیں اس اعلان کی طرف توجہ دلائی جس کی بدولت اضلاع کریم نگر، ورنگل وغیرہ میں اُردو عدالتی زبان کی حیثیت سے محروم ہو گئی ہے۔ یہ مسئلہ ہماری اس یادداشت میں بھی شامل ہے جو موجودہ چیف سکریٹری صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی ہے اور جس پر کارروائی جاری ہے۔

انجمن کی کارگزاری سے متعلق چند اور واقعات کا ذکر بھی ضروری ہے:

(۱) سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے موقع پر انجمن نے [illegible] بالراجازت دے سکتا تھا ضروری تدبیریں [illegible]

انجمن کی مقامی شاخیں موجود تھیں وہاں ان کے کارکنوں کے ذریعے سے اور جہاں شاخیں نہیں تھیں وہاں دوسرے ہمدرد اداروں اور افراد کے تعاون سے اردو، تلگو اور انگریزی زبانوں میں کئی لاکھ پرچے تقسیم کئے گئے تاکہ اُردو بولنے والے مردم شماری کے وقت اپنی زبان صحیح طور پر درج کرائیں۔ اس کام میں شری سری نواس لاہوٹی نے آندھرا کے بعض علاقوں کا دورہ کر کے اور پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب اور عابد علی خاں صاحب نے تلنگانہ کے بعض اضلاع پر تشریف لے جاکر انجمن کی بڑی مدد فرمائی جس کے لئے ہم سب کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے انجمن نے ابتدا ہی سے ایک روایت یہ قائم کی ہے کہ چار یا پانچ سال کے بعد بڑے پیمانے پر ایک اردو کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ صوبے میں اُردو کی صورت حال کا نہ صرف حکومت بلکہ خود اُردو بولنے والوں کے تعلق سے بھی جائزہ لیا جائے اور اُردو زبان کے مسئلے کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ چنانچہ پہلی کانفرنس ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوئی تھی جبکہ سابقہ ریاست حیدرآباد قائم تھی۔ دوسری کانفرنس جو کل ہند نوعیت کی تھی ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی ریاستوں کی لسانی تنظیم کے نتیجے میں آندھرا پردیش کی ریاست قائم ہوئی۔ اور اس کے بعد ہماری تیسری کانفرنس ستمبر ۱۹۶۱ء میں منعقد ہوئی۔ پچھلی کانفرنسوں کی طرح ہمارا یہ اجتماع بھی ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اس کی بدولت سارے آندھرا پردیش کے اُردو بولنے والوں میں ایک طرح کی ہلچل پیدا ہوئی اور اکثر و بیشتر اضلاع سے تقریباً ایک سو مندوبین نے اس میں شرکت کی اور اس کی کارروائیوں میں عملی حصہ لیا۔

مشہور مورخ اور ادیب ڈاکٹر تارا چند نے صدارت کی اور ان کا خطبۂ صدارت اس قدر مقبول ہوا کہ اس کو علیحدہ کتابچے کی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ حکومت کے حلقوں میں بھی اس کانفرنس کا کافی اثر ہوا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ریاستی گورنر، چیف منسٹر، اسمبلی کے اسپیکر اور لیجسلیٹو کونسل کے چیرمین نے اس میں عملی حصہ لیا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ کانفرنس کی بدولت سب کو یہ احساس ہوا کہ اُردو والوں کے جائز مطالبات کے پیچھے ایک منظم اور سنجیدہ رائے عامہ بھی موجود ہے۔ کانفرنس کی منظور شدہ قراردادیں نہ صرف ریاستی حکام بلکہ مرکزی حکومت کے متعلقہ گوشوں تک بھی پہنچیں۔ کانفرنس میں مختلف اضلاع سے اُردو کے جو نمائندے شرکت کے لئے آئے تھے انھیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اُردو کی ضلع کانفرنسیں منعقد کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اضلاع کے اُردو بولنے والوں نے اس مشورے کو قبول کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں ایسی دو کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ایک کریم نگر میں اور دوسری کڑپہ میں۔ حیدرآباد سے کئی اصحاب نے ان کانفرنسوں میں شریک ہو کر انھیں کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ ضلع محبوب نگر اور بعض دوسرے اضلاع کی مقامی شاخیں بھی ایسی ہی کانفرنسیں منعقد کرنا چاہتی تھیں لیکن چین کے حملے سے پیدا شدہ ہنگامی حالات کے باعث سر دست یہ خیال ترک کرنا پڑا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انجمن کا ایک اہم مقصد اُردو زبان میں معیاری اور مفید کتابوں کی تصنیف اور ترجمے کا انتظام کرنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑے اہتمام اور خرچ کا طالب اور ہمارے موجودہ مالی وسائل سے باہر ہے۔ تاہم اس سلسلے میں بھی انجمن اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ سابقہ چھ کتابوں کے علاوہ گزشتہ دو سال کے اندر مزید پانچ کتابیں اور شائع کی گئیں جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ چراغ منزل۔ انتخاب کلام شاہد صدیقی۔
۲۔ تلگو ادب کی تاریخ۔ از ڈاکٹر راؤ وزینت ساجدہ۔
۳۔ "پاس گریباں"۔ انتخاب کلام سلیمان اریب۔
۴۔ تلگو۔ اُردو لغت۔ از گوپال کرشنا راؤ۔
۵۔ اُردو تلگو لغت۔ از ڈاکٹر راما راجو۔

اب میں انجمن کے دو اور ادارے اُردو ادرینٹل کالج، اور اُردو آرٹس کالج کا مختصر ذکر کر کے اس رپورٹ کو ختم کروں گا:۔

(باقی)

برطانوی کتابوں کی نمائش

اگلے دو یا تین مہینوں میں برٹش کونسل ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کتابوں کی بارہ نمائشیں منعقد کرے گی۔

ایک نمائش تو اونچے معیار کی ان سائنسی و فنی کتابوں کی ہوگی جو پچھلے سال برطانیہ میں شائع ہوئی ہیں۔ دوسری نمائشیں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے تدریسی عملہ اور طلبہ کی دلچسپی کی کتابوں پر مشتمل ہیں۔ ہر نمائش میں ایک شعبہ اُن سستی کتابوں کا بھی قائم کیا گیا ہے جو برطانوی ناشروں نے ہندوستان کی ضروریات کے پیش نظر شائع کی ہیں۔

یہ نمائشیں نئی دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے بعد دوسری یونیورسٹیوں کا بھی دورہ کریں گی۔

بقیہ

علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کا دیباچہ

ادبی تاریخ نہ صرف افکار کی تاریخ ہے نہ صرف فن پاروں کی تحسین۔ اس میں سب سے پہلے تحقیق سے خام مواد لیا جاتا ہے خام مواد کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے، ورنہ یکطرفہ ہو جانے کا امکان ہے۔ اس کے بعد فن اور فن پاروں کی قدر شناسی کا سوال آتا ہے جس میں تحسین کو پرستش سے اور تنقید کو بتھراؤ سے بچانا ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ میں قدر شناسی اگرچہ منفرد کارناموں کا جائزہ لیتی ہے مگر اصناف کے ارتقا کا شعور ضرور رکھتی ہے، اور محض قدامت میں عظمت یا جدت میں لذت نہیں دیکھتی۔ یہ تغیر پذیر ادب کو بدلتے ہوئے مگر مسلسل تہذیبی ارتقا کی روشنی میں پرکھتی ہے۔ اُردو میں اس عمومی نظر کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اگرچہ خاص خاص درخت گننے کا شعور خاصا نمایاں ہے مگر پورے جنگل کے ساتھ انصاف ابھی عام نہیں ہے۔ پھر ادب کو ایک فن لطیف سمجھتے ہوئے، اسے کسی مذہبی یا سیاسی یا علاقائی عینک کے بغیر دیکھنے، اور اس کے ہزار شیوۂ حسن کو پہچاننے کی ضرورت اب بھی نہایت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

مجموعی نظر کی کمی کے علاوہ اُردو میں اور بھی کچھ دقتیں ہیں۔ کچھ نقادوں نے دبستانوں کو اتنی اہمیت دی کہ وہ ہمارے تحت شعور کا جز بن گئے۔ دہلی اسکول سے جو لوگ متاثر رہے ہیں وہ عموماً لکھنؤ اسکول کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ اسکول کے پرستاروں نے اکثر آرایش و زیبایش ہی کو حُسن سمجھا ہے۔ فورٹ ولیم اسکول اور دکن اسکول کے نام بھی خاصے عام ہیں اور کچھ لوگ عظیم آباد اسکول، آگرہ اسکول اور رام پور اسکول تک کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دبستان انگلستان کے ادبی دبستانوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہاں رومانی و کلاسیکی، آگسٹن، وکٹورین کے فکر و فن کے واضح معنی و مفہوم ہیں۔ اس لئے ہماری جدید ادبی تاریخ ان دبستانوں کو نظر انداز تو نہیں کر سکتی، مگر ان کی اسیر کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر ہمارے یہاں علاقائی پاسداری بھی رہی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ زبان نے بعض اوقات پنجاب، بہار اور دکن کے کارناموں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ دکن کے ادب پر بعض دکنی محققوں نے بہت اچھا کام کیا ہے، مگر اس ادب کی پرکھ میں اعتدال اور توازن ہر جگہ برقرار نہیں رہ سکا۔ "پنجاب میں اُردو" کی اشاعت کے بعد "دکن میں اُردو" "مدراس میں اُردو" "میسور میں اُردو" "بہار کا اُردو ادب" جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اور ان میں قابل قدر مواد ملتا ہے مگر یہ کتابیں علاقائی پاسداری سے بلند نہیں ہو سکیں۔ اس لئے ہم نے "علی گڑھ تاریخ ادب اُردو" کی ترتیب و تدوین میں دبستانوں کی تقسیم کو غیر ضروری سمجھا، اور علاقائی پاسداری کو بھی اہمیت نہیں دی۔ ہم نے جلدوں کی ترتیب میں سب سے پہلے صدیوں کو پیمانہ بنایا۔ اس کے بعد جہاں بڑے تاریخی واقعات نے عہد آفرینی کی ہے وہاں انھیں سنگ میل سمجھ کر ان سے مواد کی حد بندی میں مدد لی۔ اس وجہ سے "علی گڑھ تاریخ ادب اُردو" کی ترتیب اس طور پر رکھی گئی ہے:-

پہلی جلد۔ سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۷۰۰ء تک
دوسری جلد۔ سنہ ۱۷۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک
تیسری جلد۔ سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک
چوتھی جلد۔ سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک
پانچویں جلد۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے حال تک

اس کے باوجود مضامین میں بھی اور جلدوں میں بھی سلسلۂ کلام کے لئے کبھی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنا پڑا ہے کبھی آگے نظر ڈالنی پڑی ہے۔ ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس تاریخ کی پہلی جلد میں ایک لسانیاتی مقدمہ دیا گیا ہے، تاکہ ادب کی تاریخ کے مطالعے میں زبان کی بنیادی خصوصیات پیش نظر رہیں۔ ہر جلد کے شروع میں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے سے ہر دور کی روح کو سمجھنے میں اور اس کی روشنی میں فن اور فنکاروں کی اہمیت کا تعین کرنے میں مدد ملے گی۔

اس تاریخ کی تدوین میں تقریباً پچاس ممتاز محققوں، ادیبوں اور عالموں نے حصہ لیا ہے۔ ان کے انفرادی نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے کتاب کی وحدت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

پہلی جلد میں معلومات پر قدرتاً زیادہ زور ہے۔ اس لئے یہ تنقیدی کم ہے [illegible] زیادہ۔ اسی لئے نمونوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ بعد کی جلدوں میں بتدریج نمونے کم ہوتے گئے ہیں اور صرف خاص خاص موقعوں پر دیئے گئے ہیں۔ تنقیدی پہلو بھی دوسری جلد سے زیادہ اہم ہوتا گیا ہے۔

وہ مسائل جو براہ راست نہیں آ سکتے تھے ضمیمے میں لے لئے گئے ہیں۔ مشاعرے، اصلاح سخن کے معیار، مغربی شاعر، بچوں کے ادب، عورتوں کے ادب۔ اور ایسے ہی مسائل کے متعلق ضروری معلومات ضمیموں کے ذریعے سے پیش کی گئی ہیں۔

ادبی تاریخ میں یا تو تہذیبت ...
نمایاں ہو جاتی ہے یا خلاقیت ...
اول الذکر کے اثر سے ہر کارنامہ ...

جو اس دور کے ساتھ مخصوص ہے۔ موخر الذکر کی وجہ سے بعض اوقات معیار کا تصور زمانے کے ارتقا سے علیحدہ ہو کر کیا جاتا ہے اس لئے اس تاریخ میں ویلک کی اصطلاح "منظریت" (Perspectivism) پر زیادہ توجہ ہے۔ اس طرح دونوں نظریوں کی گنجائش نکل آتی ہے اور اعتدال اور توازن کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔

اُردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کی پیداوار ہے جس میں ہندوستانی بنیاد، ہندوستانی فضا اور ہندوستانی عناصر کے علاوہ چند قابل قدر ایشیائی عناصر بھی شامل ہیں۔ بعد میں اس کو مغرب کے معیاروں اور قدروں سے بھی آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اس لئے اُردو ادب پر سنسکرت، ہندی، فارسی، عربی، انگریزی ادب کا جو اثر معلوم یا نا معلوم طور پر پڑا ہے، اس کا اس تاریخ میں احساس موجود ہے۔ اردو ادب پر فارسی ادب کا اثر دوسرے ادبیات سے زیادہ نمایاں ہے، اس کے عرفان کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح تصوف، بھگتی اور انسان دوستی کی دوسری تحریکوں کے اثرات بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ مغربی اثرات تمام جدید ہندوستانی زبانوں کے ادب کی طرح جدید اُردو ادب پر بھی بہت گہرے ہیں اور ان اثرات کے پیچھے مغربی علم و دانش کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ پانچویں جلد کے آخر میں اُردو ادب کے مجموعی سرمائے پر اس غرض سے ایک علیحدہ مضمون میں بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

کوئی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ خصوصاً تحقیق و تنقید میں تو برابر نئے نئے حقائق سامنے آتے رہتے ہیں۔ ادب میں پرانی تعبیریں یکسر باطل نہیں ہوتیں، مگر نئے حقائق کے اثر سے ان کی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "علی گڑھ تاریخ ادب اُردو" کے ذریعہ سے اردو ادب کے ارتقا اور اس کے افکار و اقدار اور کارناموں کا ایک واضح تصور اُبھرے گا، اور اُردو ادب کا ہندوستانی سرزمین اور ہندوستانی فضا سے گہرا تعلق اور اسکی ہندوستانی روح کی ترجمانی سب پر آئینہ ہوگی۔ یہ توقع ہے کہ اس کام سے ایسے ہی اور کتنے کاموں کے لئے راہیں کھلیں گی تاکہ اس میں جو خامیاں رہ گئی ہیں وہ دور ہو سکیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ پہلی جلد کے ایک مضمون نگار ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا حال ہی میں سری نگر میں انتقال ہو گیا۔ دکن کے ادبی کارناموں کو منظر عام پر لانے میں مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے قطب شاہی دور کے فنکاروں کی اہمیت کو واضح کر کے اور لسانیات اور صوتیات پر جدید اصولوں کی روشنی میں کام کر کے ہماری تاریخ کے کئی تاریک گوشوں سے نقاب اُٹھایا تھا اور ہمارے تحقیقی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا تھا۔

ہم ان تمام مضمون نگاروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اس کام میں ہماری مدد کی، اور ان کے بھی جنھوں نے مدد کا وعدہ فرمایا گو وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ خصوصاً ہم یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی سرپرستی اور اعانت کی وجہ سے یہ اسکیم عمل میں آ سکی۔

مالک انجمن ترقی اُردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا